Ib. No 2186 ... Regd No A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone ...

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰ - شمارہ ۲۷ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

اختر حسن (حیدرآباد)

گذشتہ سے پیوستہ

"قطب مشتری" اور "سب رس" کے

مصنف مُلّا وجہی کا فارسی دیوان

یہاں تک کہ وہ اپنی گدائی اور فقیر منشی کی زندگی پر فخر کرنے لگتا ہے۔ لیکن بے زری اور تنگدستی نے بہرحال اس کی زندگی کو بے حد تلخ اور اندوہگیں بنا دیا تھا کیونکہ ان حالات میں نہ تو وہ اپنے شوقِ میخواری کو پورا کر سکتا تھا اور نہ دادِ عشق و محبت دے سکتا تھا۔ اپنی مفلسی کے باعث "بتوں" کے آگے بھی اُسے شرمندہ ہونا پڑتا تھا کیونکہ عاشقی صبر طلب ہی نہیں زر طلب بھی تو ہوتی ہے۔ ؎

شرمندہ ام بتاں از بے زری وجہی ● کس حال من بر شاہ دکن گفت یا نگفت

سلطان محمد کے زمانہ میں بادہ نوشی و میخواری کی ساری آسانیاں اور آزادیاں یکسر ختم ہو چکی تھیں۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی طرف وہ بار بار اپنے فارسی اشعار میں اشارے کرتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ "آج کل بادشاہ کے خوف سے اس شہر میں شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں ملتا اور میں بنت رز کی صحبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو پھر بتاؤ کہیں کیا کروں؟ کیا شراب کے بجائے بھنگ پینے لگوں یا افیون کا استعمال شروع کر دوں"؟ ؎

ز خوفِ شاہ دریں شہر بادہ پیدا نیست ● بہ بنگ میل کنم یا بہ کوکنار کدام؟

اور پھر ایک جگہ بڑے زعم کے ساتھ کہتا ہے کہ کوتوال شہر کی کیا مجال کہ شراب نوشی سے ہمیں باز رکھے کیونکہ گدایانِ طریقت پر بادشاہ کا کوئی حکم نہیں چل سکتا۔

چیست قدرت شحنہ را تا منع از بادہ کند ● بر گدایانِ طریقت حکم شاہنشاہ نیست

پھر ایک مسلسل غزل میں وہ کہتا ہے کہ کسی خدا نا ترس نے جسکے دل میں پہلے سے میرے خلاف بغض و نفرت کی آگ بھری ہوئی تھی، موقع پاکر بادشاہ کو میری طرف سے بدظن کر دیا اور میری نیک نامی کو نقصان پہنچایا۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ ان اشعار میں وجہی نے کس شخص کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے بادشاہ کو وجہی کا مخالف بنا دیا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ بادشاہ سلطان محمد تھا جس کے پندرہ سالہ دورِ حکومت میں وجہی مسلسل گوشہ نشین رہا۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

عبث از من جدا کرد است دشمن پادشاہم را
گہ از او ست گو ناحق بہ خیر گفت گناہم را
بگوشِ شہ رسانید است جرمے را کہ لائق نیست
پناہ و خویشتن می سازد بہ ایں حیلہ پناہم را
صوابم را بہ صد حیلہ لباسِ جرم پوشانید
گر سوئے فلک را ہم بخواہد داد آہم را
از او دل ایں خدا ناترس گویا بغض در دل داشت
بہ بدنامی من آورد آخر نیک خواہم را

آخر کار زمانہ بدلا۔ سلطان محمد کے بعد عبداللہ قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا (۱۰۳۵ھ) تو وجہی کے دن بھی پھرے۔ نئے اور نوجوان بادشاہ نے اس عمر رسیدہ اور پختہ کار شاعر کو اپنے دربار میں باریاب کیا۔ اہل دربار اور شعرائے وقت نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا اور دکن میں پھر ایک بار وجہی کا طوطی بولنے لگا۔ وجہی نے اپنی زندگی کے اس نئے دور کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ کہتا ہے :۔ "تمہیں خبر بھی ہے، میرا عہدِ تنگدستی ختم ہو گیا۔ میں نے اپنی گدائی اور گوشہ نشینی کی زندگی ترک کر دی ہے اور نئے بادشاہ کے لطف و کرم سے اب میں پھر دولتمند بن گیا ہوں" ؎

نشنیدۂ وجہیہ گدائی گذاشتم ● گشتم تونگر از کرم بادشاہ نو!

وجہی نے متعدد اشعار میں اس نئے دور کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کسی تاریخ یا تذکرہ سے وجہی کی وفات کا سنہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اس نے طویل عمر پائی۔ عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے کوئی تیرہ سال بعد یعنی ۱۰۴۵ھ میں اس نے اپنی تصنیف "سب رس" پایۂ اتمام کو پہنچائی۔ اس وقت اس کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہوگی۔

وجہی کے ایک فارسی شعر سے اس کے ایک سکونتی مکان کا محل وقوع بھی ظاہر ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی چنانچہ اسی دشواری پر قابو پانے کے لئے محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ موسیٰ ندی کے کنارے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جسے بعد میں محمد قلی کی چہیتی ملکہ حیدر محل کے تعلق سے حیدرآباد کا نام دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حیدرآباد بہشت بنیاد" کی تعمیر سے پہلے گولکنڈہ میں مکانوں کی کمی سے تنگ آکر شاعر نے گولکنڈہ کی آبادی سے باہر کھلی فضا میں اپنا ذاتی مکان بنوایا تھا جس کی جانب اس نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

تنگ آمدہ از خانۂ ہر شہر شہر وجہی • چوں جانوراں کلبۂ صحرائے ز خس بست

وجہی کے زیر نظر فارسی دیوان میں بعض قطعات بہت اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان میں سے دو قطعات سوری راؤ کی شکایت اور مذمت میں ہیں۔ گولکنڈہ کی سلطنت کے وزیر اعظم امین الملک کے انتقال ۱۰۰۰ھ کے بعد عارضی طور پر سوری راؤ کو مملکت قطب شاہیہ کا میر جملہ مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اور پھر ۱۰۱۱ھ میں ایران کے ایک نووارد، نوجوان شاعر میر محمد امین میر جملہ شہرستانی کو یہ عہدۂ جلیلہ تفویض کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوری راؤ کے زمانۂ وزارت میں وجہی کو سرکاری وظیفہ و منصب کے بروقت وصول ہونے میں دشواریاں پیش آئیں چنانچہ وہ ایک فارسی قطعہ میں بادشاہ سے سوری راؤ کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "سوری راؤ نے 'زرِ سالِ گزشتہ' اب تک نہیں دیا ہے اور جب کبھی میں عرضی گذرانتا ہوں تو ہر بار وعدہ کر لیتا ہے لیکن کوئی وعدہ بھی ایفا نہیں کرتا ؎

وعدہ می دہد مرا ہر روز • کہ بآں وعدہ نے مراست نہ پاؤ (دیاتو)

اس قطعہ میں وجہی نے دکھنی اردو کے بعض الفاظ بھی بے تکلف استعمال کئے ہیں اور قطعہ کے آخری شعر کا دوسرا مصرع تو پورے کا پورا قدیم اردو میں ہے اور خوب ہے۔ کہتا ہے کہ ؎

سالِ رفت و ہنوز می گوید • خوب ہے کیا اُتاد (ہوتا) ہے دیکھتے جاؤ:

اسی طرح ایک اور قطعہ میں بھی سوری راؤ کی بے انتہا مذمت کی ہے اس کے بعض اشعار کرم خوردہ ہیں اور پڑھے نہیں جاتے لیکن جو اشعار پڑھے جاتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ سوری راؤ سے وجہی کے تعلقات میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوری راؤ کو ظالم، خونخوار، مردم آزار، عفریت، ابلیس، مار اور زنبور جیسے الفاظ سے مخاطب کرتا ہے اور آخر میں اپنے سرپرست و ممدوح سلطان محمد قلی قطب شاہ سے استدعا کرتا ہے کہ اب تو ہی میرے حالِ زار پر رحم فرما کیونکہ سوری راؤ سے تو انصاف کی کوئی توقع باقی نہیں رہی۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

طوطیا تیم ماست شکر بخشا! • چند گردیم گرد مردارے
خوانِ من صرفِ گرگِ راؤ است • زیر جرم است استخواں پارے
خواستم حق خود جواب نداد • چہ بگوید کسے بہ دیوارے
طوطیم ز تو عجب نبود • کہ شفائے دہی بہ بیمارے

زیر نظر دیوان کے آخر میں ایک نا تمام قصیدہ ہے۔ قیاس غالب یہی ہے کہ وجہی نے یہ قصیدہ اپنے سرپرست اوّل محمد قلی قطب شاہ کی تعریف میں لکھا ہوگا۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

پادشاہِ جہاں، جہاں پرور • ظلِ سبحان و ذاتِ پیغمبر
تو سراپا تمام آئینۂ • خوش تماشا شدی بہ خود بنگر
ہمت و علم و حلم و دانش و جود • داب و آداب و شان و شوکت و فر
جود و داد است داور دانا • جود و داد است ایزد اکبر
لے ہمہ مدح تو عاجز است ملک • ہمہ در وصفِ تو قاصر است بشر
پادشاہے چو تو نہ شد پیدا • خسرو چوں تو کس نہ شد دیگر
شاہ نوجوان دولت را • رایت آراستہ بعہد زیور
مرغ و ماہی و جن و انس ترا • شد مسخر بہ غیر انگشتر
ہیچ دورے نہ شد ازیں اعلیٰ • ہیچ عہدے ازیں نہ شد بہتر

لیکن وجہی قصیدہ کا مرد میدان نہیں تھا اسے اپنی غزل گوئی پر ناز ہے اور قصیدہ نگاری اور مدح سرائی کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا ہے۔ وجہی کی جتنی تصانیف اب تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں اس کی قصیدہ سرائی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا ہے، صرف اس کے فارسی دیوان کے آخر میں یہی ایک نا تمام قصیدہ ملتا ہے۔ وہ ایک آزاد منش شاعر تھا ہر چند کہ وہ دونوں محمد قلی قطب شاہ اور پھر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباروں سے وابستہ رہا اور ان دونوں فرمانرواؤں نے اس کی قدر و منزلت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن وہ عام طور سے اپنے ان سرپرستوں کی مدح سرائی کرتا ہوا بھی نظر نہیں آتا۔ اپنے ایک شعر میں بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ ؎

غزل گہے ز شوق خوبی آں ماہ می گویم • قصیدہ بہر گدائی گویم گدائی خوش نمی آید!

شاعری کے بارے میں وجہی نے اپنے نظریہ کا اظہار کئی جگہ کیا ہے۔ اچھا شعر وہ اسی شعر کو سمجھتا ہے جو دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہا جائے۔ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میں شعر اسی وقت موزوں کرتا ہوں جب خود سراپا شعر بن جاتا ہوں۔ ؎

تمام شعر شدہ شعر گفتہ ام چہ کنم • کہ در جہاں بجز از شعر یادگارے نیست

وہ ایک جگہ اس نے شاعری کو "سخنہائے دروغ" سے تعبیر کیا ہے، کہتا ہے کہ "چند جھوٹی باتوں کو شعر کا لباس پہنانے سے انسان کو کیا عزت حاصل ہو سکتی ہے اس لئے اے وجہی اب شاعری ترک کر دے اور کسی دوسرے کام کی طرف توجہ کر۔

سخنہائے دروغ چند ما عزت چہ خواہد بود
وجہی شاعری بگذار و فکرِ کارِ دیگر کن

ایک جگہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے وجہی تو نے ایسے شعر کہے ہیں جیسے لڑی میں موتی پروئے ہوں لیکن اس کمالِ سخن سے تجھے کیا حاصل ہوا، بس اب کوئی ایسا کام کر جس سے مال و دولت ہاتھ آئے۔ ؎

شعر گفتی الحق سفتی ہمہ لیکن وجہی • کار باید کرد کزوے سیم و زر پیدا شود

وجہی گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کا شاعر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی فضائیں فارسی شعر و نغمے سے گونج رہی تھیں۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

اداریہ

اُردو کا علاقہ کہاں ہے؟

حیدرآباد میں ہم سے ایک کرم فرما نے سوال کیا۔ اُردو کا علاقہ کہاں ہے؟ خدا جانے یہ تجاہلِ عارفانہ تھا یا بیزاریٔ زمانہ۔ بہر حال ہم نے انھیں جو جواب دیا تھا وہ شاید ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہو۔

اقبال کی ایک رباعی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے قطعہ کہہ لیجئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

یہ بات اس سوال پر بھی صادق آتی ہے۔ اُردو کا علاقہ وہ ہے، جہاں اُردو بولی جاتی ہے۔ یہ اردو سُننا ہو تو آپ دہلی سے جنتا اکسپریس کے کسی ایسے ڈبے میں بیٹھ جائیے جو کھچا کھچ بھرا ہوا ہو۔ پٹنے تک آپ کو لہجے کا فرق کئی جگہ محسوس ہوگا، زبان ایک ہی سُنائی دے گی، یہ زبان جو ہندو، مسلمان، مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے، کلرک، طالب علم، چپراسی، سبھی بولتے ہوں گے کسی کا شین قاف درست ہوگا کسی کا نہیں، کوئی زیادتی کو جاستی کہہ دے گا، مریض کو مرجی، شفاخانے کو سپھاکھانا۔ مگر وہ ہوگی اُردو۔ وہ رات کہے گا، راتری نہیں، گھر کہے گا گرہ نہیں، رام رام کرے گا، رام، رامؔ نہیں کہے گا۔ لوگ ترنگ میں اگر چہ فلمی گانے گاتے ہوں گے وہ بیشتر اُردو کی کسی غزل کے اشعار پر مشتمل ہوں گے، طالبعلموں کی بحث میں آدھے انگریزی کے الفاظ ہوں گے، مگر زبان اُردو ہوگی۔ یہ زبان اُس سرکاری، مصنوعی، کتابی جناتی زبان سے مختلف ہوگی جو گزٹ میں چھپتی ہے تو بعض اوقات بڑے بڑے ہندی داں اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتی، ریڈیو پر بولی جاتی ہے تو لوگ گھبرا کر ریڈیو سیلون لگا دیتے ہیں، خاص الخاص جلسوں میں بڑی تمکنت سے بولی جاتی ہے مگر جہاں ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہو تو چند جملوں سے آگے سہارا نہیں دیتی، جو لغت سازوں، سرکاری کمیٹیوں کے ممبروں، عالموں اور پنڈتوں نے بڑی محنت سے بنائی ہے، مگر جو کھلی ہوا اور وسیع فضا میں ٹھیر نہیں پاتی جس میں ہماری خوبصورت دھرتی کی خوشبو، ہمارے چلن کی روانی، ہماری تاریخ کی رنگا رنگ کہانی نہیں ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق اُتر پردیش کی ۸۰ فی صدی سے اوپر آبادی ہندی بولنے والوں کی ہے، ۱۱ فی صدی آبادی ہندوستانی بولنے والوں کی اور ۶ فی صدی اُردو بولنے والوں کی، لیکن اعداد و شمار سچ بھی بولتے ہیں اور جھوٹ بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس علاقے میں بھاری اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو ہندی کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں، مگر اُردو جو ہندی کی بہن ہے اور ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے اُس کا چلن اس علاقے میں زیادہ پھیلا ہوا، زیادہ گہرا، زیادہ ہمہ گیر ہے، اس لئے جو ہندی کا علاقہ ہے، وہ تھوڑے سے فرق سے اُردو کا علاقہ بھی ہے۔

جب ریاستوں کی نئی تنظیم کی کمیٹی بنی تھی تو اس نے لسانی اقلیتوں کے مسائل پر بھی غور کیا تھا۔ اس نے یہ اصول پیش کیا تھا کہ جس علاقے کی ستر فی صدی آبادی ایک زبان اور تیس فی صدی دوسری زبان بولتی ہو وہ دو زبانی علاقہ سمجھا جائے۔ علاقے کے معنی صرف ریاست کے نہیں لئے گئے بلکہ ضلع یا تحصیل تک کو اس معنی میں شامل کیا گیا۔ یعنی ستر اور تیس فی صدی کی تعداد کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ علاقے کے معنی ریاست کے نہیں اور علاقہ ایک تحصیل یا میونسپل بورڈ کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی منطقے کی کونسل نے بجائے تیس فی صدی کے پندرہ سے بیس فی صدی آبادی تک کی شرط لگائی ہے۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے چاہتے ہیں کہ کسی ریاست میں پانچ فی صدی آدمی بھی کوئی اور زبان بولتے ہوں تو اس زبان کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علاقے کے معنی ریاست کے نہیں، ایک تحصیل کو بھی اس ذیل میں لاسکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک علاقے میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اترپردیش، بہار، پنجاب اور دہلی کے علاوہ، مدھیہ پردیش، راجستھان، مغربی بنگال، مہاراشٹر، گجرات، آندھرا، میسور، مدراس میں بھی اُردو کے علاقے موجود ہیں۔ ہندوستان کی کوئی زبان اس طرح سارے ملک میں پھیلی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لئے اسے قومی زبانوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت ایک قومی فریضہ ہے اس لئے اس کی تعلیم، چلن اور استعمال کے لئے سہولتیں فراہم کرنا، ہر محب وطن کا فرض ہے۔ جنوبی ہند نے تو اپنے فرض کو پہچان لیا ہے، دیکھیں شمالی ہند کب اس فرض شناسی کا ثبوت دیتا ہے۔

اِدھر اُدھر سے

مشہور امریکی ناول نگار ہیمنگوے ہلاک

نوبل انعام پانے والے مشہور امریکی ناول نویس ارنسٹ ہیمنگوے اتوار ۲ر جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو جب اپنی بندوق صاف کر رہے تھے تو اچانک گولی چلنے سے ہلاک ہو گئے۔ ہیمنگوے اور ولیم فاکز عام طور پر امریکہ کے دو نہایت ممتاز بقید حیات مصنف سمجھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں ہیمنگوے کو اپنے ناول "دی اولڈ مین اینڈ دی سی" کے لئے ادبی نوبل انعام ملا تھا۔ اسی ناول کے لئے سال بھر پیشتر سنہ ۱۹۵۳ء میں آپ کو امریکہ کے پلٹزر ادبی انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جب آپ کا ناول "دی سن آلسو رائزز" شائع ہوا تو اس سے آپ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں آپ کا ایک اور ناول "فیرویل ٹو آرمز" چھپا تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ آپ نے کئی افسانے بھی لکھے ہیں جن میں سے بعض شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ہیمنگوے نے حال ہی میں ایک ناول تحریر کیا تھا جس کا نام ابھی ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ ہیمنگوے اوک پارک (الی نائے) میں پیدا ہوئے تھے جو شکاگو کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کے چھ بیٹوں میں سے تھے۔

سنہ ۱۹۶۱ء کا پلٹزر انعام

کولمبیا یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۶۱ء کا پلٹزر انعام سال کے بہترین امریکی ناول "To Kill a Muking Bird" کے مصنف ہارپر لی کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ پلٹزر انعامات کی ابتدا جوزف پلٹزر نے کی تھی جو پوسٹ ڈسپیچ کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ یہ انعامات امریکہ کے ادب اور صحافت کے گراں قدر انعامات ہیں۔

اردو میں سائنس کا انسائیکلوپیڈیا

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے اردو زبان کے دامن کو سائنسی لٹریچر سے مالا مال کرنے کی غرض سے اردو میں سائنس کے تین انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان علمی قاموسوں کی مجموعی تعداد پندرہ ہزار صفحات پر ہوگی۔ اردو اکیڈمی نے اس منصوبہ پر کام شروع کر دیا ہے اور طبیعیات سے متعلق انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ اکیڈمی نے اس مقصد کے لئے متعدد قابل پروفیسروں کا تعاون حاصل کیا ہے اور اس منصوبہ کو کم از کم وقت میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش جاری ہے۔ اکیڈمی نے جو تین انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، ان میں سے پہلا انسائیکلوپیڈیا طبیعیات (فزکس) سے متعلق ہوگا اور بارہ جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ دوسرا انسائیکلوپیڈیا کیمسٹری اور تیسرا احیاتیات سے متعلق ہوگا۔ یہ دونوں بھی بارہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہوں گے۔ ان میں سے ہر انسائیکلوپیڈیا کی پہلی چھ جلدوں کا ایڈیشن اعلیٰ ثانوی ایڈیشن ہوگا جس کا معیار ایسا رکھا جائے گا کہ انٹرمیڈیٹ (اعلیٰ ثانوی درجے) تک کے طلبہ اور اساتذہ اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ باقی چھ جلدوں کا ایڈیشن یونیورسٹی ایڈیشن ہوگا جس کا معیار بی ایس سی اور ایم ایس سی کے درجے کا ہوگا۔ ان علمی قاموسوں کی ہر جلد بڑے سائز کے قریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی اور بارہ جلدوں کی مجموعی ضخامت پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) صفحات کی ہوگی۔ اس منصوبے پر کل لاگت کا تخمینہ پانچ لاکھ روپے ہے۔ اور اس لئے اردو اکیڈمی کو موجودہ اندازے کے مطابق اب ایک لاکھ روپے درکار ہوں گے۔ اس ضمن میں اردو اکیڈمی کا طریق کار یہ ہوگا کہ ان تین علمی قاموسوں میں سے پہلے انسائیکلوپیڈیا (طبیعیات) کی پہلی جلد شائع کریں گی۔ جب یہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہو جائے گی اور اس عظیم منصوبے کا ایک جزو حقیقی شکل اختیار کر لے گا تو اس مطبوعہ جلد کو حکومت اور دوسرے قومی اداروں کے سامنے پیش کر کے ان سے اگلی جلدوں کے لئے امداد طلب کی جائے گی۔

بہترین اردو پشتو کتابوں پر انعام

اباسین آرٹس سوسائٹی پاکستان نے ۱۹۶۰ء کے بہترین اردو، پشتو کتابوں کے سلسلے میں جو انعامات دینے کا فیصلہ کیا تھا، اس کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی تین اردو کتب کو بہترین قرار دیتے ہوئے اباسین آرٹس سوسائٹی کے صدر نے پہلا انعام "خوش حال و اقبال" میر عبدالصمد خاں۔ دوسرا انعام "یوسف زئی افغان" اللہ بخش یوسفی۔ تیسرا انعام "اپنے دیس میں" مس فہمیدہ اختر کو دیا۔ پشتو کتب میں "ظفر اللغات" سید بہادر شاہ ظفر، دوسرا انعام "ججکول" اجمل خٹک۔ اور تیسرا انعام "تربور" مجبور ایس۔ اے۔ رحمان کو دیا گیا۔

غزل

سعود اختر جمال

جانب سو سو، سرمست مے و جام آیا
دیکھئے آج کہاں شاعر بدنام آیا

جانے کیا آج تقاضائے محبت ہے کہیں
چھوڑ کر بزم سب ساقیٔ گلفام آیا

اٹھ رہی ہیں مری جانب تجسس نظریں
آج پھر اس دل مجبور پہ الزام آیا

غیر سے آج کسی نے مجھے اپنا سمجھا
بارے کچھ تو دل بے تاب کو آرام آیا

کر گئی کام کسی کی نگہہ لطف و کرم
آج اک طائر آزاد تہ دام آیا

داغ دل و نالۂ پرسوز و غم بے پایاں
میرے حصے میں یہی عشق کا انعام آیا

تھا ہر اک گام پہ اک دام سراب منزل
وہ تو کہئے کہ مرا ذوق سفر کام آیا

کاروان غم دل اب نہ کہیں ٹھہرے گا
حسن آغاز لئے رنج خوش انجام آیا

غزل

سعادت نظیر

فصل بہار آ گئی، آپ جہاں ٹھہر گئے
آگے بڑھے تو سو کہ کر غنچہ و گل بکھر گئے

بن کر چراغ زندگی داغ جگر ابھر گئے
ظلمت شب میں اور بھی جوہر غم نکھر گئے

ہمت دل بلند تھی، ذوق طلب دو چند تھا
سخت تھے لاکھ مرحلے ان سے بھی ہم گزر گئے

راہ عمل میں ساتھ تھے کیف و نشاط زندگی
چھا گئی اک فسردگی، ہم جو کہیں ٹھہر گئے

اہل خرد کچھ اور بھی دنگ ہو کے رہ گئے
جب مرے دست شوق سے گیسو ترے سنور گئے

وہم کی گرد چھٹ گئی، حسن یقیں چمک اٹھا
فکر و نظر کے فلسفے جتنے نہ تھے، نکھر گئے

مہر سکوت لب پہ تھی پھر بھی بفرط درد و غم
ساری فضا میں یک بیک نالۂ دل بکھر گئے

وجہ سکوں نہ بن سکی قربت دل نواز بھی
درد کچھ اور بڑھ گیا، ہم جو قریب تر گئے

کشمکش حیات میں عقل و جنوں کی جنگ ہے
دل میں تری اداؤں کے جب سے نقوش اتر گئے

ان سے حیات بھی ہے اور ولولۂ حیات بھی
دل وہی دل ہیں اے نظیر غم سے جو اکے بھر گئے

غزل

ارشد صدیقی

منزل کی سمت ہم نے قدم جب بڑھائے ہیں
ہر آبلے نے راہ میں دیپک جلائے ہیں

اللہ رے جنون محبت کی سادگی
ان سے بچھڑ کے ان کے کرم یاد آئے ہیں

گلچیں بھی ہیں وہی، وہی گلشن کے پاسباں
فصل بہار نے بھی عجب گل کھلائے ہیں

چپکے سے بڑھ کے تھام لیا ہے کسی نے ہاتھ
جب راہ زندگی میں قدم ڈگمگائے ہیں

کچھ ہم ہی جانتے ہیں تری عظمتوں کے راز
ہم نے غم زمانہ! ترے ناز اٹھائے ہیں

کھلتا نہ ورنہ راہبروں کا کبھی بھرم
راہوں کے پیچ و خم بھی بہت کام آئے ہیں

ارشد جہاں بھی چھائی ہوئی غم کی تیرگی
ہم نے وہاں چراغ تمنا جلائے ہیں

غزل

صلاح الدین نیر

کوئی ماحول سہی، عہد مسرت ہو کہ غم
جن کو جینے کا سلیقہ ہے جیا کرتے ہیں

مے کشی شرط نہیں فن کے نکھرنے کے لئے
وہ بھی خالق ہیں جو اشکوں کو پیا کرتے ہیں

شام غم کتنی دل آویز ہے کیا عرض کروں
کتنے دیپک مری پلکوں پہ جلا کرتے ہیں

شور دنیا ہے بہت زیست کی راہوں میں مگر
ہم تو صرف آپ کی آواز سنا کرتے ہیں

فطرت عشق ہے تم پر کوئی احسان نہیں
یاد کرنا ہے تمہیں یاد کیا کرتے ہیں

غزل

مفتون کوٹوی

یہ بات فخر کے قابل ہے آرزو کے لئے
کہ میں نے تجھ کو چنا اپنی جستجو کے لئے

ہزار قصے تھے پیش نگاہ حسن مگر
مرا ہی ذکر چھڑا لطف گفتگو کے لئے

سمجھ گیا ہوں کہ ہے کائنات مجھ میں نہاں
اٹھا ہوں آج خود اپنی ہی جستجو کے لئے

جہاں میں دوست تو مل بھی گئے کئی مجھ کو
مگر ملا نہ کوئی منصب عدو کے لئے

دو شعر

جوش ادیب

جا تری بزم مبارک ہو تجھے اے ساقی
ہیں سلامت ابھی آنکھوں سے پلانے والے

ایک ہم ہی تھے وفا کیش وفا میں خود ہیں
اب نہ آئیں گے نظر ناز اٹھانے والے

مراسلات

یہ شعر کس مثنوی کے ہیں؟

"ہماری زبان" کے صفحات میں ایسی کئی کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے جن میں گل بکاؤلی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصے میں یہ بھی ہے کہ جب راجا اندر کو خبر ہوئی کہ بکاولی کا ایک انسان سے تعلق ہو گیا ہے تو اس نے بکاولی کو بُلوا کر حکم دیا کہ وہ پہلے آگ میں ڈال کر جلائی جائے پھر سبھا میں لائی جائے اور یہی عمل روزانہ کیا جائے۔ اس مقام کے چند شعر ایک پرانی بیاض میں "ابیات گل بکاولی" کے عنوان سے درج ہیں۔ وہ شعر ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب واقف ہوں کہ یہ اشعار کس مثنوی سے لئے گئے ہیں تو وہ براہ کرم اسی اخبار کے ذریعے سے اس مثنوی اور اس کے مصنف کے نام سے مطلع فرمائیں۔

"ابیات گل بکاولی"

قبول اُس نے کیا جلنا سدا کا　　نہ چھوڑا وصل ہرگز دل رُبا کا
سر اپنے کو وہ ہر شب جلاتی　　سدا تن کو وہ خاکستر بناتی
فراق اس کا نہ تھا ہرگز گوارا　　پہ عاشق سے نہ کرتی وہ کنارا
گوارا تن پہ ہووے نار سوزاں　　سہا جاتا نہیں پر داغ ہجراں
جسے ہو شمع رویوں کی محبت　　وہی جانے ہے نت جلنے کی لذت

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

ہندی کی ماترائیں اور اُردو کے اعراب

مذکورہ بالا عنوان کے تحت ہماری زبان مورخہ ۲۲ر جون سنہ ۱۹۶۱ء میں یم۔ اے حسن کا مضمون میری نظر سے گزرا۔ مضمون نگار نے اُردو حروف تہجی کی نسبت دو بنیادی اور اہم مسائل سے بحث کی ہے۔ ایک یہ کہ اُردو حروف تہجی کو اصل ناموں کے بجائے ہندی کے مانند ابتدائی آوازوں کے ساتھ بارہ کھڑی کی صورت میں پڑھنا سکھایا جائے تاکہ اُردو اور ہندی سیکھنے میں سہولت ہو۔ دوسرا یہ کہ اُردو حروف تہجی کو مثل ہندی کے الگ الگ حرفوں کی شکل میں ہندی ماتراؤں کے اردو بدل کے ذریعے لکھا جائے تاکہ انگریزی کی طرح جدا جدا حرفوں میں طباعت کی آسانی ہو۔ میرے خیال میں اوپر کی بحث کی نسبت حسب ذیل تنقیحات قائم کی جا سکتی ہیں:-

۱۔ آیا اُردو اور ہندی رسم خطوں میں یکسانیت ہے؟

۲۔ آیا مختلف رسم خطوں کی صورت میں ایک سے دوسری زبانوں کا سیکھنا آسان ہو سکتا ہے؟

۳۔ آیا اُردو حروف تہجی کو انفرادی صورت میں تحریر کرنا کار آمد و مفید ہے؟

۴۔ آیا مجوزہ اُردو عربی بدل موزوں ہیں؟

جوابات حسب ذیل ہیں:-

(۱) اُردو اور ہندی رسم خطوں میں یکسانیت قطعی نہیں ہے وہ ایک دوسرے کے بالکل مغائر ہیں۔ اُردو خط داہنی طرف سے اور ہندی خط بائیں طرف سے لکھا جاتا ہے۔ دونوں کی لکھاوٹ کا ڈھنگ جُدا گانہ ہے۔ اُردو خط غیر اعرابی اور ترکیبی ہے اور ہندی خط اعراب دار اور انفرادی ہے۔

(۲) جن زبانوں کا رسم خط یکساں ہوتا ہے، ان میں ایک سے دوسری زبانوں کے سیکھنے میں ابجد کے ذریعے سے پڑھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، صرف معنی مطلب کا جاننا پڑتا ہے۔ اس طرح آسانی کے ساتھ ایک سے دوسری زبانوں کو سیکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ اُردو اور ہندی کے خطوں میں بڑا فرق ہے تو کس طرح ایک اُردو جاننے والا ہندی زبان کو جلد سیکھ سکتا ہے۔ میں اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں، البتہ تعلیم کی حد تک میں ماننے کو تیار ہوں کہ اُردو کے لئے طریق الصوت نہایت مفید ہے۔ اُردو ابجد کو پہلے حرفوں کی آوازوں یعنی آ، بَ، پَ وغیرہ کے ذریعے پھر ان کے ناموں کے ساتھ سکھانا چاہئے چنانچہ میں نے اپنے "اجنتا قاعدہ" میں دیکھو اور بولو اور طریق الصوت ہی کے طریقوں کو استعمال کیا ہے۔ یہ قاعدہ صوبہ آندھرا پردیش کے علاقہ تلنگانہ میں پانچ سال سے سرکاری مدرسوں میں رائج ہے۔

(۳) اُردو خط عام طور پر ترکیبی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اب اس کو ہندی کی تقلید میں انفرادی صورت میں بدل کر لکھنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ ہر ایک زبان کے خط کا ایک نہج ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے خاص ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اُردو خط کی ایک قدیم نہج کو دوسروں کی تقلید میں تبدیل کرنا گویا اپنی ادبی تاریخ سے گریز کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اس نئے نہج کے جاننے والے قدیم نہج کے اردو علمی ذخیروں سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ پس اردو خط کی انفرادی صورت چنداں مفید نہیں ہے۔

(۴) مجوزہ اردو اعرابی بدل اُردو زبان کے لحاظ سے مناسب نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر ہندی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اُردو کا کم خیال کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ اردو میں زبر، زیر، پیش، تشدید، مد، واوِ معروف، واوِ مجہول، یائے معروف، یائے مجہول، واوِ لین، یائے لین، یائے مجہول وغیرہ، یہ بارہ اعراب بنیادی اور اہم ہوتے ہیں۔

جن کی علامتیں ترتیب وار (َ)، (ِ)، (ُ)، (ٰ)، (ٖ)، (ٗ)، (و)، (یٰ)، (ے)، (وٗ)، (ےٰ)، (آ) ہیں۔ مذکورہ اعرابوں میں واو لین، یائے لین اور رائے محدودہ اُردو میں بالکل نئے اعراب ہیں، جن کو میں نے ایجاد کیا ہے۔ نئے اعرابوں کو اپنی کتاب اردو املا میں بیان کیا ہے۔ اوپر کے اعرابوں کے لحاظ سے میری مرتبہ اُردو بارہ کھڑی اس طرح ہوگی ہے۔

مثلاً: (الف کی بارہ کھڑی) اَ اِ اُ اٰب آ اوٗ

او ای اے اوٗ اےٰ اہ

(ا ر ی)

مجوّز نے اپنے اعرابی چارٹ میں ہندی حروف علت (ए)، (ऐ)، (ओ) اور (औ) کے اُردو بدل تجویز ہی نہیں کئے ہیں۔ میری رائے میں ان کے اردو بدل سلسلہ وار یائے مجہول، یائے لین، واو مجہول اور واو لین ہونے چاہئیں۔ ہمیں اُردو بارہ کھڑی میں (अं) اور (अः) کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی ہندی کی تقلید کرلی ہو تو (अं) کے لئے (ن یا ں) اور (अः) کے لئے (ہ) علامتیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔

(غلام رسول۔ حیدر آباد دکن)

"سوز و ساز" پر تبصرہ

ہماری زبان مورخہ یکم جون ۶۱ء میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا تبصرہ فاروق بانسپاری کے مجموعۂ کلام سوز و ساز پر نظر سے گزرا۔ موصوف نے اسلامی ادب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کا تبصرہ جارحیت کا حامل نظر آتا ہے انھیں اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس تبصرہ میں علامہ اقبال کے ایک خط کے سلسلے میں ڈاکٹر اعظمی صاحب نے عجیب انداز اختیار کیا ہے ان کے بارے میں پر سو ظن تو نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مکاتیب اقبال کا مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن یہ قیاس ضرور کیا جاسکتا ہے کہ تبصرہ کرتے وقت انھوں نے اصل خط دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں فرمائی۔ مکاتیب حصہ اول صفحہ ۴۲۳ مکتوب نمبر ۲۲۱ء بنام مسعود عالم ندوی ملاحظہ ہو۔ اقبال نے یہ خط عالم برزخ سے نہیں لکھا ہے بلکہ کاتب کی غلطی نے تاریخ غلط کردی ہے۔ اس خط پر ۲۸ر مئی ۱۹۳۶ء کے بجائے ۲۸ر مئی ۱۹۳۶ء درج ہے جو خیال ہے ۲۸ر مئی ۱۹۳۶ء ہوگی۔

(کبیر احمد جائسی)

[اگر مکاتیب اقبال میں کاتب نے غلط تاریخ درج کردی ہے تو اس غلطی کو فاروق صاحب کے مجموعۂ کلام میں درست کرنا چاہیے تھا۔ اگر مسعود عالم ندوی صاحب کے نام خط کی اصل کہیں مل جائے تو اس نقل کی صحت قطعی طور پر ہو جائے گی۔ ادارہ ہماری زبان کے پاس مصدقہ اطلاع آنے پر اخبار میں اعلان کردیا جائے گا۔] (ادارہ)

پتے کی باتیں

(۱) کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پھ، بھ، دھ وغیرہ کو مفرد حروف مان کر تہجی میں داخل کرلینا چاہئے۔ اب ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ اُردو تہجی حروف پر مشتمل ہے یا characters پر۔ یقینی بات ہے حروف پر مشتمل ہے۔ تو پھر diagraphs کو ایسی تہجی میں کیونکر داخل کیا جاسکتا ہے؟ اتنا ہی ہے تو سندھی تہجی اپنا لیجئے! ٻ، ٺ، ٿ۔ کیوں کیسی نظر آرہی ہیں یہ شکلیں؟

(۲) "ہماری زبان" کے قیمتی صفحات ضائع ہورہے ہیں مگر اب تک کسی طرف سے عمر خیام کی شاعری کے بارے میں کوئی نتیجہ خیز بات نہیں سُننے میں آئی۔ ناطق صاحب کے طرفداروں سے التجا ہے کہ وہ چند ہی رباعیات کے شعراء ڈھونڈھ نکالیں۔ یہ معرکۃ الآرا رباعیاں کہنے والے شاعر اب تک گمنام کیسے رہ رہے ہیں؟ کہیں بھی ان کا تذکرہ نہیں ملتا؟ عمر خیام سے پہلے اور اس کے زمانے میں کون کون شاعر گزرے ہیں؟ کس کس سے منسوب کی جائیں یہ رباعیاں؟ ایک آدھ شاعر بھی آپ ایسا ڈھونڈ کر نہیں نکال سکتے؟

(۳) مردم شماری کی تفصیلات آنے پر یہ حساب لگائیے کہ آبادی جس تناسب سے بڑھی ہے اُردو آبادی بھی اس تناسب سے بڑھی ہے یا نہیں۔ ہر ریاست کا الگ الگ جائزہ لیجئے۔ (اقبال کرشن)

انجمن کا خبرنامہ

انجمن ترقی اُردو شاخ کامٹی کا انتخاب

انجمن ترقی اُردو شاخ کامٹی کا ایک انتخابی جلسہ زیر اہتمام ایڈ حاک کمیٹی مورخہ ۲۰ر جون ۱۹۷۱ء بوقت دس بجے شب زیر صدارت عالی جناب پنڈت گورداس رام صاحب سوز ہوشیارپوری، ریاضی ہال میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل عہدیداران اور ارکان مجلس عاملہ کے انتخابات عمل میں آئے۔

صدر: جناب پنڈت گورداس رام صاحب سوز ہوشیارپوری۔

نائب صدر: جناب محمد یوسف صاحب سوز خضرائی۔

سکریٹری: جناب ظہیر الحسن صاحب۔

نائب سکریٹری: جناب ماسٹر خورشید ارخاں صاحب۔

خازن: جناب عبد الحلیم ثانی صاحب۔

ارکان مجلس عاملہ:- جناب محمد ظہیر وارثی صاحب جناب مختار احمد ظہمی صاحب، جناب صدیق اختر انصاری صاحب، جناب قمر الزماں صاحب۔ (ظہیر الحسن سکریٹری)

واقعات کربلا اور اُردو ادب

انجمن ترقی اُردو کلکتہ کے زیر اہتمام ایک ادبی جلسہ ۱۹ر جون ۷۱ء کو دفتر انجمن میں منعقد ہوا جس میں اردو ادب پر واقعات کربلا کا اثر کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے اور تقریریں کی گئیں جلسہ کی صدارت پروفیسر عباس علی خاں بیخود نے فرمائی۔ جلسہ کا افتتاح سات بجے شام کو اسد الزماں صاحب اسد کے مقالے سے ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ مرثیوں نے اردو ادب کو ایک نیا انداز بیان دیا جو بعد کی بیشتر اچھی نظموں پر اثر انداز ہوا۔ دوسرا مقالہ اعزاز افضل نے پیش کیا۔ آپ نے مرثیے کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مرثیے نے اُردو شاعری کو نئے نئے کردار عطا کئے۔ یہاں ہمیں ماں، بہن، بھائی بہن، شوہر بیوی اور غلام آقا سب کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ افضل صاحب کے مقالے کے بعد احمد اللہ انصاری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس واقعہ نے جس قدر اردو ادب کو متاثر کیا ہے کسی اور واقعے نے دنیا کے کسی ادب کو نہیں کیا ہے۔ شاعری کی مختلف خصوصیات میں مرثیہ سے مفید اضافے کئے ہیں۔ اس کے بعد یاور لکھنوی نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں مرثیہ کی تاریخ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا اور اس کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا۔ حضرت جمیل مظہری نے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ہندوستانی ادب نے عموماً اور اُردو شاعری نے خصوصاً شہدائے کربلا کو خراج تحسین پیش کیا ہے اس طرح کی مثال فارسی و عربی میں بھی نہیں ملتی۔ بلکہ موجودہ دور کے فارسی شعراء اُردو مرثیوں کی تقلید کرنے لگے اور اس طرح فارسی کا قرض ایک حد تک اُردو ادا کر رہی ہے۔ اُردو شاعری میں مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جسے ہم اپنا کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس واقعہ نے اردو شاعری کی دوسری اصناف پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ جیت سے نئے استعارے اور تشبیہیں اُردو شاعری میں اس کے اثر سے آئیں جس سے زبان و ادب میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔

مقالوں اور تقریروں کے بعد شعراء نے اس واقعہ سے متعلق اپنی نظمیں سنائیں جو پسند کی گئیں۔

آخر میں صدر جلسہ نے نوجوانوں کو خاص طور سے اس واقعہ کے مطالعے کی طرف متوجہ کیا کیونکہ مرثیوں کو سمجھنے کے لئے اس واقعہ کا صحیح علم ضروری ہے اور بغیر مرثیوں کے مطالعہ کے اُردو شاعری کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ (طلعت شبلی۔ کنوینر ادبی کمیٹی)

تمکین کاظمی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

اُردو مجلس حیدرآباد کی جانب سے اتوار ۲۰ر جون کو صبح دس بجے اُردو ہال حمایت نگر میں اردو کے ممتاز ادیب اور محقق مولوی تمکین کاظمی کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مرحوم کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے تمکین کاظمی کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کے حوصلے بہت بلند تھے اور کام کرنے کی بھی اُن میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ ایک اُردو اکیڈیمی بنانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بیماری اور تنگدستی کی بناء پر اس خیال کو آگے نہ بڑھا سکے۔ گذشتہ سال ان کے نام ادارہ ادبیات اردو کی تحریک پر حکومت ہند سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ جاری ہو گیا تھا۔ اور سال حال سے ادارہ ادبیات اُردو نے بھی تذکرہ نودوان دکن کی ترتیب کے سلسلے میں ایک سو روپے کا فیلوشپ بھی ان کے نام جاری کیا تھا۔

مولوی تمکین کاظمی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر زور نے کہا کہ تمکین کاظمی نے علم و ادب اور شعر و سخن کی فضا میں آنکھیں کھولیں۔ ان کا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا، ان کے قلم میں بلا کی روانی تھی۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ حیدرآباد کی تمدنی تاریخ اور اس قدیم شہر کے گلی کوچوں سے یہاں (حیدرآباد میں) دو ہی اشخاص زیادہ واقف رہے ہیں جن میں ایک تمکین کاظمی تھے اور دوسرے نصیر الدین ہاشمی ہیں۔ تمکین کاظمی حیدرآباد کی تاریخ تمدن کے حافظ تھے۔ ادبی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی میں ان کی جتنی قدر ہونی چاہئے تھی افسوس ہے کہ نہ ہو سکی۔

بعد ازاں پروفیسر شروانی نے تعزیتی قرارداد پیش کی جسے حاضرین نے کھڑے ہو کر منظور کیا۔

جلسے میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔ معتمد اعزازی اُردو مجلس کے شکریہ پر جلسہ برخاست ہوا۔

(محمد منظور احمد۔ معتمد اعزازی اُردو مجلس)

اُردو ہال میں پروفیسر آل احمد سرور کی تقریر

پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند کی آمد پر ۶ر جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو اُردو ہال (حیدر آباد) میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس کے صدر پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ جناب حبیب الرحمن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے پروفیسر سرور کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اردو کی تحریک قومی نقطۂ نظر سے چلائی جا رہی ہے۔ اردو کا مسئلہ کسی فرقہ، علاقہ یا پارٹی کا نہیں، سب کا مسئلہ ہے۔ اردو یا کوئی بھی ہندستانی زبان صرف قومی تصور کے تحت ہی ترقی پا سکتی ہے۔ زبان قومی سرمایہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کو ہمارے ملک کے لوگ تسلیم تو کرتے ہیں لیکن دل سے نہیں مانتے اور اس پر عمل نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ اردو کا مسئلہ اور دوسرے لسانی مسئلے، جھگڑے اور الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر قومی وحدت کے تصور کو اپنایا جائے تو یہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی اقلیت غیر مطمئن ہے تو اس سے جمہوریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ سوال اقلیت کے فائدے کا نہیں ہے۔ اقلیت کے حقوق کو تسلیم کرنے میں اکثریت اور سارے ملک کا فائدہ ہے۔ زبان کی حفاظت محض زبان کی خاطر نہیں بلکہ قوم کی خاطر بھی ضروری ہے۔ ہم نے جمہوری نقطۂ نظر اور غیر مذہبی مملکت کو اپنایا ہے اور سوشلزم کو اپنی منزل بنایا ہے اس لئے ہمیں اس مسئلے کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکومت کسی زبان کے علاقہ کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اُردو کا علاقہ بھی وہی ہے جو ہندی کا علاقہ ہے۔ انھوں نے اُردو تحریک کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تمام سیاسی جماعتوں نے جو جمہوریت اور غیر مذہبی مملکت میں یقین رکھتی ہیں اُردو کے حق اور مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے اور انھیں انجمن ترقی اُردو کے نقطۂ نظر سے بھی اتفاق ہے لیکن برسر اقتدار جماعت اس پر عمل نہیں کر رہی ہے۔ ہم اس وقت تک خاموش نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ اُردو کو یوپی اور دوسرے علاقوں میں جہاں وہ ایک بڑی تعداد کی مادری زبان ہے سرکاری زبان تسلیم نہ کر لیا جائے اور دوسرے علاقوں میں جہاں اردو بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں انھیں تمام حقوق اور سہولتیں نہ دی جائیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ریاستی حکومتیں سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم کریں اور تسلیم شدہ باتوں کو قانون کا جزو بنائیں۔ پروفیسر سرور نے کہا کہ زبان کو بنانے والے شاعر اور ادیب نہیں بلکہ عوام ہوتے ہیں۔ شاعر اور ادیب تو عوام کی بنائی ہوئی زبان کو سنوارتے اور خوبصورت بناتے ہیں۔ ہندوستانی فلمیں اُردو زبان کی بڑی خدمت کر رہی ہیں اور فلموں کے ذریعہ اُردو زبان کی کل ہند حیثیت مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ فلم والوں نے وہی زبان اختیار کی جو آزادی کی لڑائی میں کشمیر سے راس کماری تک سارے ہندستان میں ہمارے قومی رہنماؤں نے استعمال کی تھی۔

ادب میں انحطاط کی باتیں بے معنی اور ذہنی انتشار کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات ہم زندگی کی تیز رفتاری اور موجودہ دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب ترقی کر رہا ہے اگر کچھ ادیب اور شعراء خاموش ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب میں انحطاط ہے۔ گذشتہ چند سال کے عرصہ میں اُردو کے لکھنے والوں کی جتنی تخلیقات کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اُردو اور اُردو کا ادب پچھلے چند برسوں میں تیزی کے ساتھ بیرونی ملکوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ غزل کے تعلق سے انھوں نے اپنا یہ ذاتی خیال ظاہر کیا کہ آج کل کے پیچیدہ دور میں زندگی کے بعض پہلوؤں کے اظہار کے لئے غزل کی زبان پوری طرح ساتھ نہیں دیتی اس لئے اُردو شاعری کی ترقی کے لئے نظم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آج کے حالات کا تقاضہ اور مطالبہ یہ ہے کہ نظم کی جانب زیادہ توجہ دی جائے اور شاعری کو غزل کی حد تک محدود نہ کیا جائے۔ (نامہ نگار)

پروفیسر سرور، ایوانِ اُردو میں

پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے ۴ر جولائی کو ساڑھے چار بجے ادارہ ادبیات اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ نائب معتمد ادارہ نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔ ایوان اُردو کے تفصیلی معائنہ کے بعد پروفیسر سرور نے مندرجہ ذیل تاثرات تحریر فرمائے۔

"ادارہ کو اس کی پرانی عمارت میں دیکھ چکا تھا۔ اب خوش قسمتی سے اس کی نئی اور اپنی عمارت میں دیکھنے کا موقع ملا، آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی عمارت میں حسن نظر اور ذوق سلیم کی کارفرمائی ہے۔ اس کی آرائش میں سلیقہ اور نفاست ہے اس کے کتبوں، مخطوطوں، فرامین، مخطوطات، مطبوعات اور زبان و ادب کے متعلق مواد میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفیقوں کے خون جگر کی آب و تاب بھی جھلکتی ہے۔ یہ ادارہ اُردو زبان و ادب کی صدیوں کی چمن بندی کا بڑا اچھا عکس پیش کرتا ہے۔ یہاں تحقیقی اور علمی کام کرنے والوں کے لئے بڑا خزانہ موجود ہے۔ اس ادارے کی ترقی اور توسیع کے لئے کوشش اُردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں اور ہماری مشترک تہذیب کے علم برداروں کا فرض ہے۔"

(وقار خلیل)

[illegible]

بقیہ

"قطب مشتری" اور "سب رس" کے مصنف مُلّا وجہی کا فارسی دیوان

دہلی، بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں فارسی شعر و ادب کی قدردانی اور سرپرستی اپنی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ دہاں نغانی کے نئے رنگ اور نئے انداز سخن سے اس دور کے کم و بیش سبھی شاعر متاثر تھے دہلی میں اکبر، بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ اور گولکنڈہ میں محمد علی قطب شاہ کی حکومتوں کا عہد اپنے شباب پر تھا ایران میں صفوی خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ شاہ عباس صفوی برسر اقتدار سلطنت تھا ہندوستان کے شاہی درباروں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ایران و عراق کے ارباب علم و ادب ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کھنچے چلے آ رہے تھے اور شاہی بذل و کرم سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی بھی اس دور میں نسبتاً آسودگی و فراغت کی منزلوں سے گزر رہی تھی، ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کے آثار پیدا تھے خصوصاً سلاطین، امراء اور حاضرین کے طبقہ میں عیش و عشرت کے تمام سامان اکٹھا ہو گئے تھے جسکی بدولت ہر شعبۂ حیات میں انتہا سے زیادہ تکلف اور تصنع پیدا ہو گیا تھا شعر و ادب پر بھی اس ماحول کا اثر پڑ رہا تھا اور سعدی و حافظ کی سادگی و خوش جمالی کے بجائے شاعری میں معنی آفرینی، نکتہ رسی، لفظی صنعت گری، طرز بیان کی پیچیدگی اور تشبیہات و استعارات کی جدت و ندرت کو اہمیت حاصل ہو گئی تھی جسکی بدولت خصوصاً فارسی غزل کو ایک نیا آہنگ اور ایک نیا پیراہن مل گیا تھا۔ عرفی، فیضی، طالب آملی، ظہوری وغیرہ فارسی شاعری کے دوسرے متعدد جگمگاتے ہوئے ستارے کم و بیش اسی زمانے میں ادب کے آسمان پر طلوع ہوئے مضمون نے اپنی سخن سرائی کو

سخن آفرینی کے ذریعہ ہندوستان میں ایک نئے فکری رجحان و مزاج کی بنیاد رکھی۔ وجہی بھی اسی دور کا شاعر ہے لیکن اسکی زندگی نے جس دکن میں نشو و نما پائی تھی اس میں متعدد قومیت اور مشترکہ تہذیب کا ایک نیا عنصر بھی شامل تھا۔ دکن میں ایک نئی زبان جنم لے رہی تھی جس کا بیج شمالی ہند سے دکن میں پہنچا تھا لیکن اس سرزمین کی جداگانہ خصوصیات اور یہاں کے مخصوص سیاسی اور معاشرتی حالات کی بدولت اسکے پودے کا رنگ روپ

بالکل بدل گیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس نومولود زبان کو پروان چڑھایا اور دکھنی اُردو میں دادِ سخن دی اس کے دربار سے جتنے شاعر اور ادیب وابستہ تھے ان کا تعلق زیادہ تر عراق و ایران ہی سے تھا۔ ان میں جو نووارد تھے وہ تو فارسی زبان کو ہی اپنائے رہے لیکن جن خاندانوں کو یہاں رہتے ہوئے کچھ مدت گذر گئی تھی، انھوں نے دکھنی اردو میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ وجہی کا تعلق آخرالذکر گروہ سے تھا۔ وہ بنیادی طور پر اردو کا ادیب شاعر تھا لیکن فارسی اسکی آبائی زبان تھی، اس لئے اس نے فارسی کا دامن بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسکی فارسی شاعری میں دکھنی اُردو کے ابتدائی دور کی سادگی اور بے ساختگی کے اثرات ملتے ہیں وہ اپنے عہد کے جدید ادبی رجحانات کے مقابلے میں فارسی کے ادب عالیہ کا پرستار اور معتقد نظر آتا ہے۔ فارسی کے اساتذۂ سخن جیسے حافظ، خسرو، خاقانی حسن اور کمال وغیرہ کا ذکر وہ بڑے ادب احترام کے ساتھ کرتا ہے اور ان کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے ؎

خیالات کمال و ناز کیہائے حسن بند است
کہ سوز خسرو و الفاظ حافظ در سخن دارم

بعض مقامات پر بزعم تعلی اپنے آپ کو خسرو و خاقانی کا ہم پلہ بلکہ اُن سے بھی بلند پایہ شاعر ظاہر کرتا ہے۔ ؎

نے بچو حسن یافت وجیہی نہ چو خسرو — نقش غزل تازہ خود طرزِ اگر بست!
وجیہہ جائے تو بالائے دست خاقانی ست — کہ زیر حرف نوشتن خطا بود مُدرا
بچگی ہائے شعر خاقانی است — در تخیلہائے نیم خام مرا

شاعرانہ تعلی میں وجہی نے بعض موقعوں پر زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن مبالغہ و غلو سے قطع نظر وجہی کے ان اشعار سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اسے اپنی فارسی دانی پر کتنا اعتماد تھا۔ تعلی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بے نظیر وقت خویشم در سخن آراستن — قرنہا باید کہ یک شاعر کسے چوں من شود
نکتہ ام معنی ہمہ قرآن — حرفم اسرار صد ہزار کتاب
واقعی از خلاصۂ ہمہ چیز — بے نظیری وجیہہ در ہمہ باب

گل خوش رنگ نظم خود بہ بزم و انش آوردم
کہ گردد چوں رُخ خوباں قبول خاطر دلہا
معجزہ شعر است و ما پیغمبر وقت خودیم
کافر است آں کس کہ شک آرد بدیں اعجاز ما

تعظیم واجب است بر اہل خسرو وجیہہ
بیروں بر آمدہ است ز مصحف کتاب را
گر گرد دوئے دیدن ما در دل کسے است
ما را تواں شناخت ز طرز کلام ما
وجود عقد ثریا شدہ نبات النعش
کہ چرخ چرخ زد از شوق شعر خوانی ما
گر شعر مرا فاتحہ تا خواندہ بخوانی
بر جان دولت لذت آں شعر حرام است

ان تمام تعلیوں کے باوصف وجہی کے فارسی کلام میں کوئی خاص ندرت یا انوکھا پن نہیں ہے۔ اُس نے غزل کے روایتی انداز سخن سے کوئی انحراف نہیں کیا ہے۔ عشق و محبت، شراب نغمہ اور گل و رخسار کے پامال مضامین ہی اس کی غزل کے مضامین ہیں۔ تاہم اُس کی فارسی غزلوں سے اچھے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو ایسے متعدد اشعار مل جائیں گے جو ندرت بیان اور طرز ادا کی خوبیوں کے باعث فارسی شاعری کے بیش قیمت خزانہ میں اضافہ کا باعث بن سکیں گے۔ سردست وجہی کے چند منتخب اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں ؎

جاناں بہ بیں بہ چشم خود امروز سوئے ما
کز روئے تو چہ رنگ گرفتست روئے ما
یک منزل است عیش دل و صد ہزار رہ
خوں شد زخار غم قدم جستجوئے ما
حدیث خواہش دل، بر زباں ہرگز نمی آید
سپر گشتست روئے عجز از رنگ تغافل ہا
باش خوش دل بہ محنت بسیار — زاں کہ آسودگی کم است اینجا
امروز گفتہ کہ بیایم بخواب شب!
در دیدہ خواب نیست کہ آئی بخواب ما
وجیہہ جامہ دری نیز عالمے دارد!
نشاطیاں چہ شناسند ذوق ماتم را
ز جوشش گریہ آفتہا درون آستیں دارم
بہ دریا بیز تر دامن کہ طوفاں کردہ ام خود را
گفتم بدہ بوسہ از آں شکریں دہن گفتا بچشم!
گفتم مشو یار کسے اے یار من گفتا بچشم
گفتم کہ اے جان جہاں مے با تو نوشم یکزماں!
بر چشمۂ آب رواں در ایں چمن گفتا بچشم
گفتم ز درد و سوز و غم بنما رُخ اے شیریں سخن
تا خسرو دیگر شوم اندر دکن گفتا بچشم
خبر از بے خبراں اے دل حیراں مطلب
خاطر جمع از آں زلف پریشاں مطلب
دیدہ داری و دلے نیز اگر دو پرستست
گوہر از بحر مجو لعل ہم از کاں مطلب
مہر گشتست دلت روشنی از ماہ مجو
لالہ شد دیدۂ تو گل ز گلستاں مطلب
زہر نوش آب رُخ ہمت عالی مفروش
چوں خضر تشنہ مشو چشمۂ حیواں مطلب
ساقیا ساقیا شراب شراب — تشنہ ام تشنہ جام آتش و آب
گل بر افشاں بہ محفل یاراں — بادہ در دہ بہ مجلس احباب
من و کنار نگار و شراب شب ہمہ شب
رسیدہ سینہ بہ سینہ کشیدہ لب در لب
ہر انچہ درد لم آمد بروئے او گفتم
کہ مست بادہ چہ داند طریق عقل و ادب
چو تنگ آمدۂ از جہاں بہ میکدہ رو
کہ دفع می کنند اندوہ روزگار شراب

تبصرہ

ریاض الرحمٰن شروانی

جیتا جاگتا

مصنف: ابن طفیل ۔ مترجم: ڈاکٹر سید محمد یوسف
واحد تقسیم کنندگان: اردو اکیڈمی سندھ، مولوی مسافرخانہ بندر روڈ، کراچی ۔ ضخامت: ۱۷۵ صفحات ۔
قیمت: مجلّد تین روپے پچاس پیسے ۔

اندلس کے مسلم فلاسفہ میں ابن طفیل کا نام ابن باجہ اور ابن رشد کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ فلاسفہ یونانی فلسفے سے متاثر تھے اور انھوں نے یونانی فکر کو اسلامی حکمت سے ہم آہنگ کرنے میں بڑی خدمت انجام دی، اگرچہ قدامت پسند علماء کی بارگاہ سے انھیں زندیق اور ملحد کے خطابات ہی ملتے رہے۔ ابن طفیل کی تصنیف حی بن یقظان سے اسلامیات کے طالب بخوبی واقف ہیں۔ اس رسالے میں اس نے قصّے کے پیرائے میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ایک صحیح العقل اور سلیم الطبع انسان محض اپنی عقل کے سہارے وحی سے بے نیاز ہو کر بھی وجود الٰہی اور توحید باری کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں فطری مناظر، روز و شب کی گردش اور موسموں کا اختلاف اس کا مدد و معاون ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ابن سینا نے بھی اس نام سے ایک رسالہ لکھا تھا لیکن ابن طفیل نے اپنی تصنیف سے صرف نام مستعار لیا ہے ورنہ دونوں قصّے ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ ابن طفیل کے رسالے کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے جن میں لاطینی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اسپینی، روسی اور ڈچ زبانیں شامل ہیں۔ اُردو میں اب تک اس کا مکمل ترجمہ کتابی صورت میں نہیں ہوا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر سید محمد یوسف صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی نے پیش نظر تالیف کے ذریعے یہ کمی پوری کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ تبصرہ اور ابن طفیل کا فکری تجزیہ بھی بہت محنت اور قابلیت سے کیا ہے۔ تبصرے میں اسلام میں عقل، نقل اور کشف کے مسئلے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان دونوں ابواب میں کئی ایسے مذہبی، تاریخی اور فکری مسائل زیر بحث آئے ہیں جن میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ مثلاً اجمال اور بنیادی اسلام سے کیا مراد ہے اور اسلام میں عقیدے کے ساتھ عمل کا کیا درجہ ہے، معتزلہ کا طرز فکر اسلامی تعلیمات کے کتنا مطابق یا مغائر تھا، معجزے کا اسلامی فکر میں کیا مقام ہے، فقہ اور فقہاء کا اسلامی تاریخ میں کیا رول رہا ہے اور انھیں کیا اہمیت حاصل ہے، دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے اور اسلام کے ہمہ گیر نظام ہونے کا کیا مقصد ہے اور شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے بارے میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سب مسائل سے تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم اس میں شبہہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان مسائل سے متعلق جو رائیں ظاہر کی ہیں غالباً ان میں سے اکثر سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوگا اور بعض سے راقم الحروف کو بھی ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو کا شمار "اسلامی زبانوں میں" کیا ہے۔ میرے خیال سے زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے اور مذاہب کی بنیاد پر ان کی تقسیم بہت سی الجھنیں اور دشواریاں پیدا کر دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "اُردو... اسلامی فکر کی خدمت کے لحاظ سے نمایاں ہے" لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو میں بعض دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی وافر مقدار میں موجود ہے اور اُردو تو علیحدہ رہی، اس اعتبار سے خود عربی کو بھی "اسلامی زبان" قرار دینا ممکن نہیں ہے ورنہ نہ صرف زمانۂ قبل اسلام کی عربی شاعری بلکہ بعد کے بھی متعدد عربی ادب سے ہمیں دست بردار ہونا پڑے گا اور یہ صورت حال کسی کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔

ترجمے میں ڈاکٹر صاحب نے یہ اصول پیش نظر رکھا ہے کہ "ترجمہ نص سے جتنا بھی ممکن ہو قریب ہو اور محاورہ اور سلاست زبان کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جائے"۔ ابن طفیل کی تصنیف کی ایک بڑی خوبی اسکی سلاست اور سادگی بھی ہے جو قدیم عربی ادب میں اسے امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجمے میں بھی یہ امتیاز قائم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ کتاب کا موضوع خالص علمی اور فلسفیانہ ہے اس لئے بعض مقامات پر عبارت کسی قدر گنجلک اور نامانوس ہو گئی ہے۔ یہ خامی بعض جگہ ان ابواب میں بھی محسوس ہوتی ہے جو ڈاکٹر صاحب کی اپنی تالیف ہیں۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا